"زبان اور اردو زبان کی تاریخ"

زبان کیا ہے؟ یہ کب پیدا ہوئی؟ اس کی تاریخ کیا ہے؟ زبان کیسے وجود میں آئی؟ ان سب سوالات کے متعلق معلومات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں۔
زبان بول چال کے اس انداز کو کہتے ہیں جس کے ذریعے ہم اپنی بات دوسروں تک پہنچاتے ہیں اللہ تعالی نے ہمیں پانچ قوتوں سے نوازا ہے جن میں قوت باصرہ، دیکھنے کی قوت۔ سامیہ سننے کی قوت، لامسا چھونے کی قوت، شامہ سونگھنے کی قوت اور قوت گویائی یعنی بولنے کی قوتیں شامل ہیں۔ یہ وہ حسسیات ہیں جن کے ذریعے ہم ابلاغ کا کام لیتے ہیں اور اپنا پیغام دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ ابتدا میں انسان چہرے کے تاثرات کے ذریعے اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا تھا۔

ہم جانتے ہیں کہ جو کچھ ہم سنناچاہتے ہیں، بولنا چاہتے ہیں وہ صرف زبان کی کے ذریعے ممکن نہیں ہوتا۔ چرند پرند اور انسان ابلاغ کے لیے چہرے کے تاثرات اور جسمانی حرکات وسکنات سے بھی کام لیتے ہیں اور یہ سلسلہ روز اول سے یوں ہی ہے لیکن یہ ہمارا بنیادی موضوع نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج بھی حرکات وسکنات کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی روز اول سے تھی۔ اس کے علاوہ ہم اشارات وعلامات سے بھی کام لیتے ہیں۔ مثلاً سرخ رنگ کی علامت، سبز رنگ کی علامت اور جانوروں کی شکلوں وغیرہ کی علامات مثلاً فاختہ امن کی علامت ہے یا اس قسم کی مختلف النوع قسم کی علامات روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔

لیکن اگر ہم زبان کی بات کریں تو یہ وہ ذریعہ ہے جو مذکورہ بالا دونوں یعنی حرکات وسکنات اور علامات، ذرائع ابلاغ سے زیادہ اہم ہیں ہم بہت سی باتیں چہرے کے تاثرات اور اشارات وعلامات سے کرتے ہیں لیکن یہ عمل اس وقت اہم ہوتا ہے جب ہم ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے۔ لیکن یہ ہماری بنیادی ضروریات سے زیادہ مدد نہیں کر سکتا کیونکہ تاریخ یا دستاویز کے متعلق اشارے کنائے زیادہ معاون نہیں ہوسکتے۔
اب یہ سوال کہ زبان کب پیدا ہوئی؟ کس طرح زبان نے الفاظ کی شکل پائی؟ زبان نے ترقی کیونکر کی؟ اردو زبان کے متعلق مختلف نظریات کون سے ہیں؟ ان سوالات کا جواب جاننے کے لیے الفاظ کا سہارا لیا جائے گا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ الفاظ کہاں سے آئے اس کا جواب اس طرح سے دیا جاسکتا ہے کہ جہاں تک انسانی تحقیق کا تعلق ہے تو قیاس کے مطابق اس کی تاریخ زیادہ پرانی اور قدیم نہیں کیونکہ جب ہم تاریخی دستاویز کو چھانتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ زبان کی تاریخ پانچ یا سات ہزار سال کی قبل میسر نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کے تحریری نمونے موجود نہیں۔

ہمارے پاس زبان کے آغاز کے متعلق ایک راستہ ہے جس کے ذریعے ہم زبان کے متعلق آشنائی حاصل کر سکیں کیونکہ ہمارے پاس کوئی ایسا انسان نہیں جو اس سلسلے میں ہماری راہ نمائی کر سکے اس کے لیے ہمارے پاس صرف اور صرف ایک طریقہ ہے اور وہ ہے تاریخ۔ لیکن بد قسمتی سے یا تو ہم ماضی کی زبانوں سے واقف نہیں اور ہمارے پاس اس کے تحریری نمونے بھی موجود نہیں۔ ایسی صورت میں ہم کیا کریں۔ ایسی صورت میں ہم یہ کہتے ہیں کہ حضرت انسان کے پاس قوت گویائی تو تھی اور وہ زبان صرف ان فطری آوازیں کے لیے جن کی اہمیت آفاقی نوعیت کی ہے، استعمال کرتا تھا۔ مثلاً تکلیف میں کوئی آواز نکالنا، حیرت کا اظہار کرنا، خوشی کے موقع پر کوئی آواز نکالنا۔ یہ وہ آوازیں ہیں جو کسی قسم کی زبان کی متقاضی نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دراصل زبان نہیں بلکہ آوازیں ہیں۔ یہاں ہمیں آواز اور الفاظ کے فرق کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔
اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرق کیا ہے؟ زبان الفاظ کا مجموعہ ہے اور یہ سب جانتے ہیں کہ الفاظ بہر حال آوازوں سے بنتے ہیں خواہ وہ کسی بھی

زبان کے الفاظ ہوں مثلاً اردو کی الف، ب اور انگریزی کی اے، بی، سی۔ یہ آوازوں کی علامات ہیں لیکن بذات خود یہ الفاظ نہیں بلکہ آوازیں ہیں۔ جب مختلف آوازیں ملتی ہیں تو الفاظ بنتے ہیں اور الفاظ کا ملاپ یا الفاظ کی خاص ترتیب جملے کو جنم دیتی ہے۔ اور معنی آوازوں میں نہیں بلکہ جملے یا لفظ میں پنہاں ہوتے ہیں لہذا جب ہم کوئی آواز نکالتے ہیں، چاہے وہ خوشی کا اظہار ہو یا حیرت کا یا کسی تکلیف کا، تو وہ دراصل آوازیں ہیں۔ وہ احساس کا اندیہ ضرور ہے لیکن اسے ہم زبان نہیں کہے گے اب یہی وجہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ زبان اور آواز میں فرق ہے۔

اب فرض کیجئے کہ کسی کو کسی تکلیف کا اظہار کرنا ہے تو وہ کوئی بھی آواز نکال سکتا ہے اس کے لیے ضروری نہیں کہ کوئی دوسرا شخص اس آواز کو سمجھ جائے کہ یہ تکلیف کی بات کی جارہی ہے۔ اگر سمجھ لے تو اس سے ہمارا ابلاغ مکمل ہو جاتا ہے لیکن مسلہ کیا ہو گا۔ مسلہ یہ ہو گا کہ جب اسے اس تکلیف کی وجہ یا سبب سے آشنا کرنا چاہیں گے کہ تکلیف کیونکر ہوئی؟ تو اس کے لیے ضروری ہو گا کہ االفاظ کا سہارا لیا جائے کیونکہ چہرے کے تاثرات اور اشارات و علامات ہماری مدد نہیں کریں گے۔ اور اس تفصیلی بات کے لیے الفاظ کا سہارا لینا ہو گا۔ آوازیں ابتدائی ابلاغ کے لیے تو کافی تھیں لیکن بعد میں جوں جوں انسانی زندگی پیچیدہ ہوتی گئی، جوں جوں انسان نے یہ سیکھا کہ معاشر تیں کس طرح ترتیب پاتی ہیں؟ تہذیبی اختلاط کس شے کا نام ہے؟ تہذیبی ٹکراؤ کس کو کہتے ہیں؟ جنگ و جدل کیا ہوتا ہے؟ اس طرح جب اقوام وجود میں آئیں۔ قوموں سے مزید قسم کی پیچیدگیاں پیدا ہوئی گویا جب انسانی زندگی پیچیدہ تر ہوتی گئی تو پھر محض انسانوں کے لیے چہرے کے تاثرات اور اشارات و علامات کافی نہیں تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان شروع سے ہی زبانوں پر قادر تھا؟ اس کا جواب ہے ہاں۔ انسان نے پہلے آوازیں نہیں بلکہ زبان سیکھی تھی یا دوسرولے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان نے شروع سے ہی زبان سیکھ لی تھی لیکن اس بات کے اثبات کے لیے ہمیں انسانی تحقیق کا نہیں الہامی روشنی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالٰی نے سورۃ البقرہ میں مرحلہ تخلیق انسانی پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ رب تعالٰی نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں انسان تخلیق کر رہا ہوں، تو فرشتوں نے استفسار کیا کہ تو کیسے بنائے گا؟ اس سے ایک مرحلہ آگے بڑھیے تو اللہ فرماتا ہے کہ اس نے آدم کو اسماء سیکھائے۔ اب اس واقعے سے ہم یہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اللہ اور فرشتوں کے

درمیان بات چیت ہوئی یا چلیں یوں سمجھ لیں کہ وہ اسماء جو آدم کو سکھائے گئے تھے وہ بہر حال بامعنی بھی تھے اور یقینی طور پر الفاظ بھی۔ سو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان روز اول سے ہی زبان پر قادر تھا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے اگر ہمارے پاس زبان تھی تو آخر کیا وجہ ہوئی کہ ہماری زبان کی تحقیقات یا لسانیاتی تحقیقات چند ہزار سال تک محدود ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ہمارے پاس جو تحریری نمونے موجود ہیں یا تو ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ یعنی ہم ان تک ان کے ابلاغ کے حوالے سے، ان کو سمجھے کے حوالے سے ان تک نہیں پہنچ پاتے۔ چنانچہ پانچ سے سات ہزار سال کی تاریخ دراصل تحریری زبان کی تاریخ نہیں ہے بلکہ بولی جانے والی زبان کی تاریخ ہے۔

اب اس مرحلے پر ہمیں یہ بات کرنی چاہئے کہ اگر تحریری زبان سے پہلے زبان اپنا وجود رکھتی تھی تو وہ کہاں تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ معاشرتیں، قبائل اور اقوام جب آپس میں ٹکراتے ہیں تو ان کے اختلاط سے نئی تہذیبیں بھی بنتی ہیں اور نئی زبانیں بھی۔ جب ایک جگہ پر رہنے والے لوگ کسی دوسری جگہ ہجرت کرتے ہیں تو وہ اپنی تہذیب اور وہ زبان ساتھ لے کر جاتے ہیں جن میں وہ ابلاغ کرتے ہیں۔ اس طرح معاشرتوں کے ملاپ یا اختلاط کے نتیجے میں ایک نئی زبان کے پیدا ہونے امکانات روشن ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ عمل ہر اختلاط میں نہیں ہوتا، ہر ملاپ میں نہیں ہوتا۔ اور اس عمل میں مہینے نہیں، سال نہیں بلکہ صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ اور یہ ایک ایسے غیر محسوس عمل کا نام ہے کہ جس میں شاید یہ طے کرنا بھی ممکن نہیں رہتا کہ کوئی زبان کس طرح بدل گئی؟ کوئی نئی زبان کس زبان سے پیدا ہو گئی؟ کوئی نئی زبان کن زبانوں کا ملغوبہ تھی؟ یہی وہ سوالات ہیں جو دنیا کی ہر زبان کے متعلق تحقیق کرتے ہوئے ہمارے سامنے آتے ہیں اور یہی وہ سوالات ہیں جن سے سابقہ ہمیں

اردو زبان کی تحقیق کے دوران بھی پڑتا ہے یعنی ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی زبان کن زبانوں کا مجموعہ ہے؟ کوئی زبان کس علاقے میں پروان چڑھی؟ اور کس بنیاد پر زبان جداگانہ تشخص قائم کر لیتی ہے؟ تو زبان اس سے کہیں پہلے پیدا ہو چکی ہوتی ہے یہی حال اردو زبان کا بھی ہے۔ اب ہم اردو زبان کے ارتقا پر بات کریں گے۔

اردو زبان کے آغاز میں یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ ہمارے محقق اس حوالے سے کیا رائے رکھتے ہیں۔ یہ زبان جس کے متعلق آپ اتنا تو جانتے ہیں کہ لفظ اردو "ترکی" زبان کا لفظ ہے اس کے معنی "لشکری" یا "لشکر گاہ" کے ہیں لیکن یہ سوالات تشنہ کام ہے کہ زبان یا زبان اردو کہاں پیدا ہوئی؟ کہاں سے اس کا آغاز ہوا؟ اس کی تاریخ کیا ہے؟

لہذا ہم زبان کی پیدائش کے متعلق مختلف نظریات پر بات کریں گے۔ ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کوئی زبان کس جگہ پیدا ہوتی ہے؟ کیونکہ زبان جب تک اپنا جداگانہ تشخص قائم کرتی ہے تو اس وقت وہ معرض وجود میں آچکی ہوتی ہے اردو زبان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اردو زبان کب، کیسے اور کہاں پیدا ہوئی؟ ان سوالات کی وضاحت کے لیے ہم یہاں چند نظریات کا تذکرہ کریں گے جو مرکزی نوعیت کے ہیں۔

اردو زبان کے متعلق پہلا نظریہ "دکن میں اردو" کے حوالے سے ہے۔ اس لیے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ پنجاب، سندھ اور دکن سے آنے والی لہریں دہلی میں آکر جمع ہوئی تو ایک نئی زبان وجود میں آئی۔ "دکن میں اردو" کا نظریہ "نصیر الدین ہاشمی" نے پیش کیا ان کا کہنا ہے کہ دکن کے ساتھ عربوں کے تعلقات فتح سندھ سے قبل، برصغیر والوں سے جڑ چکے تھے۔ عرب تجارت کی غرض سے جنوبی ہند میں مالا بار کے ساحلوں پر آتے تھے اور یہاں پر تجارت کی غرض سے قیام بھی کرتے تو اس دوران وہ آپس میں بات چیت بھی کرتے ہوں گے جس سے ایک نئی زبان بنی

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک نئی زبان کیسے بن سکتی ہے؟اس کا جواب یہ ہے کہ دو قومیں آپس میں ابلاغ کرتی ہیں تو الفاظ کا لین دین ہوتا ہو گا۔ گویا کچھ الفاظ عربی کے دکن میں آجاتے ہوں گے یا پھر دکنی زبانوں کے الفاظ عرب کے لوگوں کو سمجھ میں آنے لگے ہوں گے اور پھر وہی مخلوط الفاظ ان کی زبان بنے ہونگے گویا یہ نئے مخلوط الفاظ ان کا ذریعہ ابلاغ بنے ہونگے جس کی وجہ سے ایک نئی زبان وجود میں آئی ہو گئی۔ اب ایک لمحے کے لیے یہ مان لیا جائے کہ یہ بات درست ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تجارت کی غرض سے آنے کچھ لوگ کسی جگہ قیام کریں تو زبان پیدا ہو سکتی ہے؟اس کی وضاحت آسان الفاظ میں اس طرح سے کی جاسکتی ہے کہ اگر کوئی شخص بلوچستان سے ایران جائے تو کیا بلوچی اور فارسی کے اختلاط سے ایک نئی زبان بن سکتی ہے؟تو یقیناً جواب نفی میں ہو گا کیونکہ الفاظ کا لین دین ہمیں یہ تو بتاتا ہے کہ انھوں نے کوئی آسان راستہ اپنے لیے منتخب کیا ہو گا جس سے دونوں ایک دوسرے کی زبان سمجھ جاتے ہونگے لیکن اس سے ایک نئی زبان کا وجود میں آنا کم از کم قیاس سے باہر لگتا ہے۔

اب دیکھئے ہوتا کچھ یوں ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کی طرف سفر کرتی ہے تو اس سے نئی ثقافت، تہذیب وجود میں آتی ہے اسی طرح زبان پر بھی اس کے اثرات پڑتے ہیں اب اگر اس بات کو درست مان لیا جائے کہ اردو دکن سے ہے اور عربوں کے میل ملاپ سے ایک نئی زبان وجود میں آئی تو اردو پر فارسی یا پنجابی سے زیادہ عربی کے اثرات ہونے چاہئے تھے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اردو پر فارسی اور پنجابی کے اثرات زیادہ ہیں اسی بنیاد پر بعد میں آنے والے ناقدین نے اس نظریے کو رد کر دیا۔

اس کے بعد دوسرا نظریہ جو تاریخی اعتبار سے تو تیسرا ہے لیکن اس کا تذکرہ ہم اس لیے پہلے کر رہے ہیں کہ جنوب میں دکن واقع ہے اور جنوب

مشرق میں سندھ واقع ہے یہ بات کی جا رہی ہے دہلی کو مر کز مان کر۔لہذا جغرافیائی اعتبار سے اس نظریے کا پہلے ذکر کیا جاتا ہے۔"سندھ میں اردو"کا نظریہ" سید سلیمان ندوی "نے اپنی کتاب "نقوش سلیمانی "میں پیش کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ محمد بن قاسم ۷۱۲ء میں دیبل کی بندر گاہ پر وارد ہوا۔ بعد ازاں اس نے بر صغیر پر قبضہ کیا اور پھر ملتان تک فتوحات کیں۔ محمد بن قاسم تو دو سال بعد چلا گیا لیکن اس کے ساتھ آئے ہوئے بہت سے علما کرام، تاجر، صوفیا کرام، خاندان اور دیگر لوگوں نے یہیں بود و باش اختیار کی جس کی بدولت ایک نئی زبان کا سانچہ تیار ہوا۔

سید سلیمان ندوی کے بقول:

" مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں اس لیے قرین قیاس یہ ہے کہ
جس کو آج ہم اردو کہتے ہیں اس کا ہیولہ اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہو گا"

اس طرح کے ملاپ سے بولیاں تو تشکیل پا سکتی ہیں لیکن زبان نہیں۔زبان اور بولیوں میں فرق ہے مثلاً سرائیکی، پوٹھوہاری پنجابی زبان کی بولیاں ہیں۔سندھ میں مسلمانوں کی آمد سے بولیاں تو بنی ہوں گئی، عربی یا سندھی کا اختلاط تو ہوا ہو گا لیکن زبان اردو سندھ سے قرار دینا محققین کو محال لگتا ہے۔

اب ہم بات کرتے ہیں"پنجاب میں اردو "کی۔ پنجاب میں اردو کا نظریہ "حافظ محمود شیرانی "نے پیش کیا۔انھوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اردو نہ دکن سے ہے اور نہ ہی سندھ سے۔ بلکہ اس کا تعلق پنجاب سے ہے اور اس کی دلیل میں وہ لسانیاتی شواہد بھی پیش کرتے ہیں اور تاریخی شواہد بھی۔

تاریخی اعتبار سے دلیل دیتے ہوئے حافظ محمود شیرانی کہتے ہیں:

"اردو کی داغ بیل اسی دن پڑنا شروع ہو گئی تھی جس دن مسلمانوں
نے ہندوستان مین آکر توطن اختیار کیا۔"

اسی طرح سید سلیمان ندوی کے نظریے کے متعلق بات کرتے ہوئے حافظ محمود شیرانی کہتے ہیں کہ:

"سندھ میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے اگر کوئی نئی زبان
بنی تھی تو غزنوی دور میں، جو ایک سو ستر سال پر محیط ہے، ایسی مخلوط یا
بین الاقوامی زبان ظہور پذیر ہو سکتی ہے"

ان دو مختلف بیانات کا مطالعہ کیا جائے تو حافظ محمود شیرانی کی بات خاصی منطقی معلوم ہوتی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد بن قاسم ۷۱۲ء میں سندھ آیا۔ دکن سے مسلمانوں یا عربوں کے تعلقات ۷۱۲ء سے قبل کے قائم تھے لیکن پنجاب سے جڑنے والا رشتہ ان دونوں تعلقات یا ذرائع سے مستقل تھا۔ ایک ہزار عیسوی سے محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملے کرنے شروع کیے اور ایک ہزار چھبیس عیسوی تک مسلسل حملے کرتا رہا ۔اس کے بعد غوری، قطب الدین ایبک اور اس کے بعد حملوں کا ایک طویل سلسلہ خلجی، تغلق اور مغلوں تک جاری رہتا ہے یا یوں کہیئے کہ غوری سے شروع ہونے والا حملوں کا یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری و ساری رہتا ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے باقاعدہ طور پر مسلمانوں کے ذریعے ہندوستان پر حکومت قائم کی یہ تمام لوگ فارسی بولتے تھے۔ لیکن اس کے مقابلے میں دکن سے صرف ایک رشتہ تجارت کا تھا اور سندھ سے رشتہ صرف ایک فاتح محمد بن قاسم کا تھا۔ اس کے مقابلے میں کم و بیش پنجاب سے ایک ہزار سال کا تعلق اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جب دوسرے کمزور ذرائع مثلاً دکن اور سندھ سے ایک زبان تشکیل پا سکتی ہے تو کیا ایک ہزار سال میں زبان میں آنے والی تبدیلیاں زیادہ نہ ہونگی۔ یہ تو تھا حافظ محمود شیرانی کا زبان کے حوالے سے تاریخی نظریہ۔ اب ہم لسانیاتی اعتبار سے حافظ محمود شیرانی کے اس نظریے کے دلائل میں

مثالیں دیکھتے ہیں۔

اس حوالے سے بات کرتے ہوئے حافظ محمود شیرانی کہتے ہیں:

"اردو چونکہ پنجاب میں بنی اس لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو موجودہ پنجابی
کے مماثل ہو یا اس کے قریبی رشتہ دار ہو۔ بہر حال قطب الدین ایبک
کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان لے کر روانہ ہوتے
ہیں جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں۔"

اس بیان کی روشنی میں اگر اردو اور پنجابی کا تقابل کریں تو صورت حال واقعی خاصی حد تک درست نظر آتی ہے یعنی حافظ محمود شیرانی کا نظریہ دوسرے نظریات کے مقابلے میں قرین قیاس لگتا ہے۔ اگر اردو اور پنجابی کے جملوں کی ساخت پر غور کیا جائے تو وہ ایک جیسی ہے مثلاً فاعل، مفعول اور فعل۔ یعنی 'میں سکول جاتا ہوں' اگر اس جملے کو پنجابی میں ترجمہ کریں تو 'میں سکول جاناواں' ہو جائے گا۔ ان دونوں صورتوں میں "میں" یعنی فاعل اور سکول یعنی مفعول بالکل اسی ترتیب سے آرہے ہیں جو اردو میں نظر آتی ہے۔ اردو اور پنجابی میں جمع، واحد۔ تذکیر و تانیث اور دیگر قوائد اردو تقریباً ایک جیسے رہتے ہیں۔

سو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دکن اور سندھ میں الفاظ کا اختلاط ہوا اور پنجاب میں الفاظ کے اختلاط کے نتیجے میں ایک نئی زبان بن گئی۔ یوں حافظ محمود شیرانی نے تاریخی اور لسانی دونوں بنیادوں پر اپنے نظریے کو ثابت کیا۔ اس نظریے کو بہت سے نظریہ ساز تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ اب تک تمام نظریات کو ہم نے علاقے کے حوالے سے پیش کیا ہے یعنی زبان علاقے سے ہے زبان سے نہیں۔ کچھ ناقدین نے زبان، زبان سے وجود میں آئی، پر بھی بحث کی ہے۔

جس میں جدید لسانی اصولوں کے مطابق چند نظریہ ساز ایسے آئے جنھوں نے یہ کہا کہ زبان علاقے سے نہیں زبان، زبان سے وجود میں آتی ہے اگر منطق کی رو سے دیکھا جائے تو یہ بات درست بھی ہے کیونکہ ایک جگہ پر رہنے والا شخص دوسری جگہ چلا جائے تو علاقہ بدل جاتا ہے لیکن اس کی زبان وہی رہتی ہے چنانچہ اب ہم یہ کہتے ہیں کہ زبان علاقے سے نہیں بلکہ زبان، زبان سے پیدا ہوتی ہے اب اس نظریے پر بات کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ ناقدین کیا آراء کو پیش کرتے ہیں؟

اس حوالے سے ہمارے پاس دو نظریہ ساز ہیں جن کے نظریات ایک جیسے ہیں۔ ان میں ایک "شوکت سبز واری "ہیں جنھوں نے "تاریخ زبان اردو" میں اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔ دوسرے "مسعود حسن خان "ہیں جنھوں نے "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔

اس حوالے سے بات کرتے ہوئے شوکت سبز واری دہلوی زبانوں میں اردو زبان کو تلاش کرتے ہیں۔ اس دور میں کھڑی بولی، پالی اور سنسکرت کی قدیم صورتیں اور ہریانوی جیسی بولیاں دہلی کے گردونواح میں بولی جاتی تھیں۔ اور شوکت سبز واری کا خیال یہ ہے کہ دراصل وہ اردو جو ہم � آج بولتے ہیں وہ ان بولیوں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ وہ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

" اس میں شک نہیں کہ پنجابی اور اردو میں ہندوستان کی دیگر زبانوں
کے مقابلے میں قریب ترین مماثلت موجود ہے اس کی صرف و نحو اور
مسائل میں باہم مطابقت موجود ہے اور ساٹھ فی صد سے زاید

الفاظ ان میں مشترک ہیں"

ہم آپ کو لسانی اصولوں وضوابط میں الجھنا نہیں چاہتے بس اتنا کہا جاسکتا ہے کہ سنسکرت وہ زبان ہے جو اعلیٰ طبقے کے ہندو بولتے تھے اور پالی وہ زبان ہے جو ہندوؤں کے اشرافیہ کی زبان تھیں لیکن یہ دونوں زبانیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس لیے ماند پڑ گئی کہ یہ بازار گھاٹ میں نہیں بولی جاتی تھیں۔ چونکہ یہ عام طبقے تک نہیں پہنچ سکی تھیں، اور جو زبان عام طبقے تک نہ پہنچ سکے وہ زبان اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ بہر حال رہی بات اردو کی پالی کی ترقی یافتہ شکل ہونے کی تو اس حوالے سے ہم زیادہ کچھ اا س وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ زبان جیسے پالی کا نام دیا جاتا ہے، کے ادبی نمونے ہمارے ہاں اس طرح سے رائج نہیں رہے یا ملتے نہیں ہیں۔ اگر کسی دور میں اردو نے پالی سے کچھ سیکھا بھی ہو گا تو وہ، وہ دور ہو گا جب قطب الدین ایبک کے فوجی، جیسا کہ حافظ محمود شیرانی نے کہا تھا کہ قطب الدین ایبک کے فوجی دلی کی طرف سفر کر کے گئے تو اس وقت ان کے پاس ایک زبان آچکی تھی اس وقت اس پالی نے بھی ممکن ہے اہم کردار ادا کیا ہو ہم اس سے انکار نہیں کرتے لیکن دوبارہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہم زبان کی ابتدا کی حوالے سے بات کر رہے ہیں نہ کہ اس کی ارتقا کی۔

اب اس کے بعد ہم مسعود حسن خان کے نظریے کی بات کرتے ہیں۔ انھوں نے بھی اس سے کچھ ملتی جلتی رائے دی لیکن مسعود حسن خان نے اسے پالی سے زیادہ ہریانوی کے زیادہ قریب بتایا اب چونکہ ہریانوی زبان پنجابی زبان کے زیادہ قریب ہے لہذا مسعود حسن خان کا یہ نظریہ ان کے نظریے کو" اردو پنجاب میں،"یا یوں کہہ لیجئے،"اردو پنجاب سے ہے"کے نظریے کے زیادہ قریب لے آتا ہے۔

مجموعی طور پر آج ہم نے تین بنیادی نظریات کی بات کی اول، دکن میں اردو۔ دوم، سندھ میں اردو۔ سوم، پنجاب میں اردو۔ اس کے بعد ہم نے طائرانہ جائزہ شوکت سبزواری اور مسعود حسن خان کی آراء کا لیا۔ لیکن بنیادی طور پر دیکھا جائے تو اردو زبان جو ایک طرف تجارتی اغراض سے آنے والے عربوں کی وجہ سے جنم لیتی ہے۔ دوسری طرف سندھ سے آنے والے فاتحین یعنی محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والی افواج کے ساتھ آئی اور تیسرا پنجاب سے آنے والے فاتحین کے نتیجے میں وجود میں آئی۔

اگر ہم ان تینوں نظریات کو جوڑ دیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ جنوب مغرب، جنوب مشرق اور شمال سے پیدا ہونے والی زبان کی لہریں بالآخر دہلی میں یکجا ہو گئی اور جہاں پر ایک نئی زبان اردو بنی۔ پھر اس زبان کا ادب تخلیق ہوا اور وہ ادب ارتقائی مراحل طے کرتا کرتا ہم تک پہنچا۔ تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تینوں اطراف سے اردو زبان نے اثرات قبول کیے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو پر پنجابی کے اثرات سب سے زیادہ ہیں کیونکہ یہاں سب سے زیادہ فاتحین آئے۔ اس پر سندھ کے اثرات کم ہیں اور عربی کے اثرات اس سے بھی کم ہیں کیونکہ عربی کا اردو سے اس طرح کا تعلق نہیں جس طرح فارسی کا ہے۔

آج کی اس بحث کو اس نکتے پر ختم کرتے ہیں دراصل دکن، سندھ اور پنجاب تینوں اردو زبان کی تخلیق میں معاون رہے۔ لیکن وہ زبان جسے آج ہم بولتے، جانتے اور سنتے ہیں دراصل دہلی میں اور اس کے گرد و نواح میں تشکیل پاتی ہے کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں پر جہاں دہلی نے اردو زبان کو ادبی مرتبہ دیا۔ اور آج یہ زبان کسی بھی عالمی زبان یا عالمی ادب کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اردو ایک مخلوط زبان ہے اور اس کا یہی ایک پہلو اسے ایک

کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان لے کر روانہ ہوتے
ہیں جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے تکلم کر سکیں۔"

اس بیان کی روشنی میں اگر اردو اور پنجابی کا تقابل کریں تو صورت حال واقعی خاصی حد تک درست نظر آتی ہے یعنی حافظ محمود شیرانی کا نظریہ دوسرے نظریات کے مقابلے میں قرین قیاس لگتا ہے۔ اگر اردو اور پنجابی کے جملوں کی ساخت پر غور کیا جائے تو وہ ایک جیسی ہے مثلاً فاعل، مفعول اور فعل۔ یعنی 'میں سکول جاتا ہوں' اگر اس جملے کو پنجابی میں ترجمہ کریں تو 'میں سکول جاناواں' ہو جائے گا۔ ان دونوں صورتوں میں "میں" یعنی فاعل اور سکول یعنی مفعول بالکل اسی ترتیب سے آرہے ہیں جو اردو میں نظر آتی ہے۔ اردو اور پنجابی میں جمع، واحد۔ تذکیر و تانیث اور دیگر قواعد اردو تقریباً ایک جیسے رہتے ہیں۔

سو ہم کہہ سکتے ہیں کہ دکن اور سندھ میں الفاظ کا اختلاط ہوا اور پنجاب میں الفاظ کے اختلاط کے نتیجے میں ایک نئی زبان بن گئی۔ یوں حافظ محمود شیرانی نے تاریخی اور لسانی دونوں بنیادوں پر اپنے نظریے کو ثابت کیا۔ اس نظریے کو بہت سے نظریہ ساز تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ اب تک تمام نظریات کو ہم نے علاقے کے حوالے سے پیش کیا ہے یعنی زبان علاقے سے ہے زبان سے نہیں۔ کچھ ناقدین نے زبان، زبان سے وجود میں آئی، پر بھی بحث کی ہے۔

جس میں جدید لسانی اصولوں کے مطابق چند نظریہ ساز ایسے آئے جنہوں نے یہ کہا کہ زبان علاقے سے نہیں زبان، زبان سے وجود میں آتی ہے اگر منطق کی رو سے دیکھا جائے تو یہ بات درست بھی ہے کیونکہ ایک جگہ پر رہنے والا شخص دوسری جگہ چلا جائے تو علاقہ بدل جاتا ہے لیکن اس کی زبان وہی رہتی ہے چنانچہ اب ہم یہ کہتے ہیں کہ زبان علاقے سے نہیں بلکہ زبان، زبان سے پیدا ہوتی ہے اب اس نظریے پر بات کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ ناقدین کیا آراء کو پیش کرتے ہیں؟

اس حوالے سے ہمارے پاس دو نظریہ ساز ہیں جن کے نظریات ایک جیسے ہیں۔ ان میں ایک "شوکت سبزواری" ہیں جنھوں نے "تاریخ زبان

اردو" میں اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔ دوسرے "مسعود حسن خان" ہیں جنھوں نے "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں اپنے نظریات کی وضاحت کی ہے۔

اس حوالے سے بات کرتے ہوئے شوکت سبز واری دہلوی زبانوں میں اردو زبان کو تلاش کرتے ہیں۔ اس دور میں کھڑی بولی، پالی اور سنسکرت کی قدیم صورتیں اور ہریانوی جیسی بولیاں دہلی کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھیں۔ اور شوکت سبز واری کا خیال یہ ہے کہ دراصل وہ اردو جو ہم � آج بولتے ہیں وہ ان بولیوں کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ وہ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

" اس میں شک نہیں کہ پنجابی اور اردو میں ہندوستان کی دیگر زبانوں
کے مقابلے میں قریب ترین مماثلت موجود ہے اس کی صرف و نحو اور
مسائل میں باہم مطابقت موجود ہے اور ساٹھ فی صد سے زاید
الفاظ ان میں مشترک ہیں"

ہم آپ کو لسانی اصولوں و ضوابط میں الجھنا نہیں چاہتے بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ سنسکرت وہ زبان ہے جو اعلیٰ طبقے کے ہندو بولتے تھے اور پالی وہ زبان ہے جو ہندوؤں کے اشرافیہ کی زبان تھیں لیکن یہ دونوں زبانیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس لیے ماند پڑ گئی کہ یہ بازار گھاٹ میں نہیں بولی جاتی تھیں۔ چونکہ یہ عام طبقے تک نہیں پہنچ سکی تھیں، اور جو زبان عام طبقے تک نہ پہنچ سکے وہ زبان اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ بہر حال رہی

بات اردو کی پالی کی ترقی یافتہ شکل ہونے کی تو اس حوالے سے ہم زیادہ کچھ اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ زبان جیسے پالی کا نام دیا جاتا ہے، کے ادبی نمونے ہمارے ہاں اس طرح سے رائج نہیں رہے یا ملتے نہیں ہیں۔ اگر کسی دور میں اردو نے پالی سے کچھ سیکھا بھی ہو گا تو وہ، وہ دور ہو گا جب قطب الدین ایبک کے فوجی، جیسا کہ حافظ محمود شیرانی نے کہا تھا کہ قطب الدین ایبک کے فوجی دلی کی طرف سفر کر کے گئے تو اس وقت ان کے پاس ایک زبان آچکی تھی اس وقت اس پالی نے بھی ممکن ہے اہم کردار ادا کیا ہو ہم اس سے انکار نہیں کرتے لیکن دوبارہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہم زبان کی ابتدا کی حوالے سے بات کر رہے ہیں نہ کہ اس کی ارتقا کی۔

اب اس کے بعد ہم مسعود حسن خان کے نظریے کی بات کرتے ہیں۔ انھوں نے بھی اس سے کچھ ملتی جلتی رائے دی لیکن مسعود حسن خان نے اسے پالی سے زیادہ ہریانوی کے زیادہ قریب بتایا اب چونکہ ہریانوی زبان پنجابی زبان کے زیادہ قریب ہے لہذا مسعود حسن خان کا یہ نظریہ ان کے نظریے کو" اردو پنجاب میں،"یایوں کہہ لیجئے،"اردو پنجاب سے ہے"کے نظریے کے زیادہ قریب لے آتا ہے۔

مجموعی طور پر آج ہم نے تین بنیادی نظریات کی بات کی اول، دکن میں اردو۔ دوم، سندھ میں اردو۔ سوم، پنجاب میں اردو۔ اس کے بعد ہم نے طائرانہ جائزہ شوکت سبزواری اور مسعود حسن خان کی آراء کا لیا۔ لیکن بنیادی طور پر دیکھا جائے تو اردو زبان جو ایک طرف تجارتی اغراض سے آنے والے عربوں کی وجہ سے جنم لیتی ہے۔ دوسری طرف سندھ سے آنے والے فاتحین یعنی محمد بن قاسم کے ساتھ آنے والی افواج کے ساتھ آئی اور تیسرا پنجاب سے آنے والے فاتحین کے نتیجے میں وجود میں آئی۔

اگر ہم ان تینوں نظریات کو جوڑ دیں اور یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ جنوب مغرب، جنوب مشرق اور شمال سے پیدا ہونے والی زبان کی لہریں بآلاخر دہلی میں یکجا ہو گئی اور جہاں پر ایک نئی زبان اردو بنی۔ پھر اس زبان کا ادب تخلیق ہوا اور وہ ادب ارتقائی مراحل طے کرتا کرتا ہم تک پہنچا ۔تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تینوں اطراف سے اردو زبان نے اثرات قبول کیے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو پر پنجابی کے اثرات سب سے زیادہ ہیں کیونکہ یہاں سب سے زیادہ فاتحین آئے۔ اس پر سندھ کے اثرات کم ہیں اور عربی کے اثرات اس سے بھی کم ہیں کیونکہ عربی کا اردو سے اس طرح کا تعلق نہیں جس طرح فارسی کا ہے۔

آج کی اس بحث کو اس نکتے پر ختم کرتے ہیں دراصل دکن، سندھ اور پنجاب تینوں اردو زبان کی تخلیق میں معاون رہے۔ لیکن وہ زبان جسے آج ہم بولتے، جانتے اور سنتے ہیں دراصل دہلی میں اور اس کے گردونواح میں تشکیل پاتی ہے کیونکہ یہی وہ جگہ ہے جہاں پر جہاں دہلی نے اردو زبان کو ادبی مرتبہ دیا۔ اور آج یہ زبان کسی بھی عالمی زبان یا عالمی ادب کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اردو ایک مخلوط زبان ہے اور اس کا یہی ایک پہلو اسے ایک گھمبیر اور مشکل زبان بنا دیتی ہے۔